www.rahimia.org

شریعت، طریقت اور اجتماعیت پر مبنی دینی شعور کا نقیب

ماہنامہ رحیمیہ لاہور

نومبر 2026ء / جمادی الاخریٰ ۱۴۴۸ھ

جلد نمبر 18، شمارہ نمبر 11 قیمت: 40 روپے • سالانہ ممبر شپ: 450 روپے

بانی

حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری

قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ السَّعِید مسند نشین رابع خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور

مدیرِ اعلیٰ

حضرت اقدس مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

جانشین حضرت اقدس رائے پوری رابعؒ

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن (سرپرست)

مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی (صدر)

مولانا مفتی محمد مختار حسن (صدر انتظامیہ)

انیس احمد سجاد ایڈووکیٹ (مدیر)

ترتیبِ مضامین

- حلال وحرام سے متعلق ہدایات کو چھپانا جرم ہے
- دینی فہم وبصیرت کی فضیلت
- حضرت سوید بن حارث ازدی رضی اللہ عنہ
- ''مفکرِ پاکستان'' اور ایک صدی کی قومی ناکامی: اقبال کے نام لیواؤں نے اقبال سے کیا سیکھا؟
- مجبور محنت کش کی رضامندی، حقیقی رضامندی نہیں
- حقیقتِ ایمان اور اس کے بنیادی ارکان
- ایمان؛ تصدیقِ قلبی سے عملی زندگی تک
- نفاق کی حقیقت، اقسام اور علامات
- برصغیر میں سیاسی غداری اور نفاق کا منفی کردار
- سلطان سلیمان اعظم کی قانون اصلاحات اور دفاعی اقدامات
- دینی مسائل

ارشادِ گرامی

حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ مسند نشین ثانی خانقاہ عالیہ رحیمیہ رائے پور

''(بعض) لوگ بناوٹ سے اپنے آپ کو حقیر ظاہر کرتے ہیں، حال آں کہ دل میں اپنے متعلق ایسا (کچھ) نہیں ہوتا۔ یہ تو نفاق ہے اور کسرِ نفسی (اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنا) اگر واقعی ہو تو یہ بڑی چیز ہے۔ ہمارے حضرت (شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ) نے فرمایا تھا کہ: ''ایک دفعہ حضرت (مولانا رشید احمد) گنگوہیؒ نے اثنائے گفتگو فرمایا کہ: ''مَیں تو مٹی کا مادھو ہوں''۔ حضرتؒ (رائے پوری) نے عرض کیا کہ: ''حضرت! اس لفظ کے معنی سمجھ میں نہیں آئے''، تو فرمایا کہ: ''واقعی مجھ میں کچھ نہیں ہے''۔ حضرت والا نے فرمایا کہ: ''جو شخص اپنے ربّ کو پہچانتا ہو کہ سب کچھ اسی کا ہے۔ اور مَیں عدم (بے وجود ہوں)، وہ (ذات الٰہی) موجود۔ مَیں ممکن الوجود (جس کا ہونا محض امکانی حیثیت رکھتا ہے)، وہ واجب الوجود (جس کا وجود یقینی ہے)۔ بھلا وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے (یعنی کچھ بھی نہیں سمجھتا)''۔

(۲۲ محرم الحرام ۱۳۶۳ھ / 17 دسمبر 1946ء، بروز: منگل، مقام: ڈھڈیاں)

(ارشادات حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، ص: 254، طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور)

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

0092-42-36307714,36369089-www.rahimia.org

Email: info@rahimia.org

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

www.rahimia.org

حلال وحرام سے متعلق ہدایات کو چھپانا جرم ہے

گزشتہ آیات (164 و 165) میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ معاشی ضروریات حاصل کرنے کے لیے اللہ پر اعتماد کرنا ضروری ہے اور آیات (172 و 173) میں بتایا گیا کہ انسانی اجتماعیت کی ترقی کے لیے کھانے پینے کی چیزوں میں حلال وحرام کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ یہ واضح کیا گیا کہ انسان اپنے کھانے پینے کی چیزوں میں دو بنیادی احکامات کی پابندی کرے: ایک تو یہ کہ ہر خبیث اور بدبودار چیز۔ جو طبع سلیم کو ناپسند ہو۔ سے پرہیز کرے، جیسا کہ مردار اور جمے ہوئے خون کو کھانا پینا۔ یہ انسانی طبیعتِ سلیم کے لیے انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ "ملتِ ابراھیمیہ حنیفیہ" کے احکامات کے تحت خنزیر کا گوشت اور وہ جانور جسے غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو، اسے کسی صورت نہ کھایا جائے۔ ان چاروں چیزوں کے کھانے پینے سے بچنا' تکمیلِ انسانیت کے لیے ضروری ہے۔

اب ان آیات (2-البقرہ:174 تا176) میں گزشتہ آیات میں بیان کردہ تمام اُصولوں کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ان علوم کو چھپانا درست نہیں، بلکہ ان احکامات کی تعلیم کو انسانیت میں عام کرنا ضروری ہے اور جو لوگ ان تعلیمات کو چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے میں دنیاوی مفادات حاصل کرتے اور مال بٹورتے ہیں، وہ نہ صرف اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ اُن سے بات کرے گا، نہ اُنھیں پاک کرے گا، بلکہ سخت ترین عذاب میں مبتلا کرے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب، اور لیتے ہیں اس پر تھوڑا سا مول): اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتاب میں بیان کیے گئے احکامات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر انسانیت کی ترقی کے لیے کسبِ معاش کے اُصول، طریقے اور کھانے پینے سے متعلق حلال وحرام کے احکامات اللہ کی طرف سے گویا فرض اور لازم کر دیے گئے ہیں۔ انسانیت کی ترقی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے جو لوگ ان احکامات کو چھپاتے ہیں، معاشی رزق کے حصول کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے حرام کیے ہوئے معاملات اور اشیا کو حلال بنانے یا اللہ کی حلال کی ہوئی اشیا کو حرام بنانے کا کام کرتے ہیں، اُن کے لیے سخت وعید بیان کی گئی ہے۔ یہ لوگ دراصل دنیا کی معمولی قیمت کے بدلے اللہ کے احکامات کی خرید وفروخت کرتے ہیں۔ دنیا کی تمام تر بڑی سے بڑی دولت لے کر بھی دراصل معمولی "ثمن" (قیمت) پر احکامات فروخت کرتے ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ: "یعنی: اللہ کی نافرمانی اور خلقُ اللہ (اللہ کی مخلوق) کی گمراہی پر بس نہیں کی، بلکہ اس حق پوشی کے عوض میں جن کو گمراہ کرتے تھے، ان سے اُلٹا رشوت میں مال بھی لیتے تھے، جس کا نام "ہدیہ" اور "نذرانہ" اور "شکرانہ" رکھ چھوڑا تھا، حال آں کہ یہ حرام خوری مردار اور خنزیر کے کھانے سے بھی بدتر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسی حرکاتِ شنیعہ (بُری حرکتوں) کی سزا بھی سخت ہوگی، جس کو آگے بتلایا جاتا ہے"۔

اللہ کی نازل کردہ کتاب میں جاری کردہ حلال وحرام سے متعلق احکامات کو نظر انداز کرنے والے اور کتاب اللہ کے علم کو چھپانے والے دو طبقے ہیں:

1۔ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ (وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ): ایک تو وہ مال دار لوگ ہیں، جو اللہ کے حرام کردہ شراب اور خنزیر کھانے پینے کے لیے اپنے احبار ورُہبان اور علما کو نذرانہ دے کر اِنھیں حلال کروا کر کھاتے پیتے ہیں، انھیں اور نذرانے وصول کرنے والوں کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو نظر انداز کر کے دراصل اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ: "یعنی: گو ظاہر نظر میں ان کو وہ مال لذیذ اور نفیس معلوم ہو رہا ہے مگر حقیقت میں وہ آگ ہے جس کو خوش ہو کر اپنے پیٹ میں بھر رہے ہیں جیسا طعام لذیذ میں زہر قاتل ملا ہوا ہو، کہ کھاتے وقت لذت معلوم ہوتی ہے اور پیٹ میں جا کر آگ لگا دے"۔

2۔ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن): علم چھپانے والوں کا دوسرا طبقہ اُن احبار ورُہبان اور علما کا ہے، جو ہیں تو کتاب اللہ کے عالم، لیکن کتاب کے احکامات کو معمولی قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں، جو رشوت کے پیسے لے کر احکاماتِ الٰہیہ کو تبدیل کرنے کا دھندہ کرتے ہیں۔ اُن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کسی طرح سے نرم لہجے میں کلام اور گفتگو نہیں کرے گا، بلکہ انتہائی سختی سے محاسبہ کرے گا اور نہ ان کے دلوں کا تزکیہ کرے گا۔ اس لیے کہ اُن کے باطن اور قلوب میں حرام کی کھائی ہوئی کمائی کی آگ موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اُن کے ساتھ گفتگو نہ فرمانے سے متعلق آیت کی تشریح کرتے ہوئے حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ: "اس میں یہ شبہ کسی کو ہو سکتا ہے کہ دیگر آیات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جنابِ باری تعالیٰ قیامت کو ان سے خطاب فرمائے گا۔ سو کلام نہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ لطف ورحمت کے ساتھ ان سے کلام نہ کیا جائے اور بہ طورِ تخویف، وتذلیل، وتہدید، ووعید جنابِ باری تعالیٰ ان سے کلام کرے گا، جس سے ان کو سخت صدمہ اور غم ہوگا۔ یا یوں کہیے کہ بلا واسطہ ان سے کلام نہ کیا جائے گا اور کلام کرنے کا جو ذکر ہے، وہ ملائکۂ عذاب کی وساطت سے ہوگا"۔

اس طرح الٰہی علم کو چھپانے والے لوگوں کے دو بنیادی جرائم کی سزا؛ پیٹوں میں آگ بھرنا اور قیامت کے دن اللہ کا اُن سے کلام نہ کرنے کی صورت میں دی گئی ہے۔

وَلَا يُزَكِّيْهِمْ (اور نہ پاک کرے گا ان کو): انسانیت کی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے باطن میں پیدائشی طور پر محبتِ الٰہیہ کا "نُقطۂ حُبّیہ" رکھا گیا ہے، جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ: "كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ" (ہر بچے کی پیدائش فطرت پر ہوتی ہے)۔ (صحیح بخاری، حدیث:1385) امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ:

"انسانی روح میں ایک نورانی لطیفہ ہے، جو طبعی طور پر اللہ کی جانب ایسا میلان اور جھکاؤ رکھتا ہے، جیسا کہ لوہا مقناطیس کی طرف کشش رکھتا ہے۔ اس نقطۂ نورانی کی اس

www.rahimia.org

کشش کو ''محبتِ ذاتیہ'' کہا جاتا ہے''۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

اب آیت میں بتلایا جارہا ہے کہ جن لوگوں نے دنیا میں اللہ کے احکامات کے مطابق حلال وحرام کی پابندی کی تو اُس کے نتیجے میں اللہ کی طرف کشش اور محبت کا وہ نورانی نقطہ پاک صاف ہوجاتا ہے۔ اسی کو ''تزکیہ'' اور ''تہذیبِ نفس'' کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس کی پابندی نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے باطن کو پاکیزہ نہیں کرے گا۔

اس آیت کے ذیل میں حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:

''فائدہ: ''وَلَا يُزَكِّيهِمْ'' (نہ پاک کرے گا) کی دھمکی سے یہ امر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر کسی کے دل میں محبتِ الٰہی خوب راسخ ہے۔ اگر سرِدست (دنیا میں) محسوس نہ ہو تو اس کو ''ہیچوا خگر بہ زیرِ خاکستر'' (زیرِ زمین راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی طرح) سمجھنا چاہیے۔ قیامت کو جب کُل موانع (تمام رُکاوٹیں) دُور ہوں گے تو اس (دل میں راسخ محبتِ الٰہی) کا ظہور کامل ہوگا، کیوں کہ اگر یہ نہ ہوتا تو پھر کفار کو یہ دھمکی ایسی ہوگی کہ کوئی اپنے دشمن کو ناخوشی اور اعراض سے ڈرانے لگے، جو بالکل بے سود ہے۔ محبانِ جاں نثار اِعراضِ محبوب (محبوب کی پہلوتہی) کو دردِ جاں گداز (جان کو پگھلانے والا درد) سمجھتے ہیں، نہ اعداء (دشمن)۔ بس معلوم ہوا کہ قیامت کو ہر سینہ اللہ کی محبت سے ایسا لبریز ہوگا کہ یہ بے التفاتی، عذابِ دوزخ سے بھی بدرجہا زیادہ ان کو جانکاہ معلوم ہوگی''۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (اور ان کے لیے ہے عذاب دردناک): انسانوں کا اللہ کی کتاب کو نظرانداز کرنے کی وجہ سے اپنے پیٹوں میں آگ بھرنا، اللہ تعالیٰ کا اُن سے کلام نہ کرنا، اور اُن کے دلوں اور باطن کو پاک نہ کرنا، انتہائی دردناک عذاب کے علاوہ اَور کیا ہے؟ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں: ''واقعی اس سے زیادہ اور کیا ''عذابِ الیم'' ہوگا کہ ظاہر بدن سے بڑھ کر ان کے باطن میں بھی آگ ہوگی اور محبوبِ حقیقی ان سے ناخوش ہوگا۔ پھر اس مصیبتِ جانکاہ سے کبھی نجات نہ ملے گی۔ نعوذ باللہ (ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں)''۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں: ''یعنی: اہلِ ایمان گو کتنے ہی گنہگار ہوں، مگر دوزخ میں زمانۂ معین تک رہ کر اور گناہوں سے پاک ہوکر جنت میں داخل کردیے جائیں گے۔ بہ خلاف کفار کے کہ وہ ہمیشہ نار (آگ) میں رہیں گے اور کبھی پاک ہوکر جنت میں جانے کے قابل نہ ہوں گے۔ امورِ شرکیہ نے ان کو بہ منزلۂ نجسُ العَین (ذاتی ناپاکی) کے بنادیا ہے کہ نجاست ان کی کسی طرح دور نہیں ہوسکتی اور مسلمان عاصی (گناہ گار مسلمان) کا حال ایسا سمجھئے کہ پاک چیز پر نجاست واقع ہوگئی، نجاست زائل ہوکر پھر پاک ہوگیا''۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (یہی ہیں جنھوں نے خریدا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب بدلے بخشش کے، سو کس قدر صبر کرنے والے ہیں وہ دوزخ پر): انسانیت کی ترقی اللہ کی طرف سے اُس کے لیے مقرر کیے گئے سیدھے راستے پر چلنے میں ہے۔ اللہ کی کتاب ہدایت کا ایسا راستہ واضح کرتی ہے، جس میں نہ صرف اس دنیا میں کسبِ معاش اور کھانے پینے سے متعلق ارتفاقات سے متعلق واضح ہدایات اور احکامات ہیں، بلکہ دلوں کو پاک کرنے اور قربِ بارگاہِ الٰہی کی طرف لے جانے والے راستے کی ہدایات بھی دیتی ہیں۔ جب کہ انسانیت کی گمراہی یہ ہے کہ وہ ارتفاقات کے اُمور میں بھی حلال وحرام کی پرواہ کیے بغیر دنیا کی زندگی بسر کرے اور اقترابات الٰہیہ سے متعلق احکامات کو چھوڑ دے۔ جو لوگ انسانیت کی بھلائی کے لیے اللہ کے نازل کردہ علوم اور احکامات کو چھپاتے ہیں، وہ دراصل ہدایت کے بدلے میں گمراہی خریدتے ہیں اور اپنی دنیا وآخرت تباہ کرلیتے ہیں۔ وہ کیسے عجیب لوگ ہیں، جو دنیا اور آخرت کے عذاب پر ڈٹے ہوئے ہیں اور ذرا خوف اور شرم نہیں کرتے کہ وہ بھڑکنے والی آگ سے خود کو محفوظ رکھیں۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ (یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمائی کتاب سچی، اور جنھوں نے اختلاف ڈالا کتاب میں وہ بیشک ضد میں دور جا پڑے): اللہ تعالیٰ کے احکامات کو چھپانے والے لوگوں کے لیے اس سخت ترین عذاب نازل ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کتاب اللہ میں نازل کیا ہے، وہ بالکل برحق اور انسانیت کی فطرت کے مطابق ہے، اُس کی ترقی کے لیے لازمی اور ضروری ہے اور وہ اُس پر پوری طرح یکسوئی کے ساتھ عمل کیے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اور دوسری وجہ یہ کہ انھوں نے کتاب اللہ کی غلط تشریح کے ذریعے سے احکاماتِ الٰہیہ میں اختلاف اور انتشار پیدا کردیا۔ اُس سے انسانیت کی ترقی کا راستہ بند ہوجاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ضد میں احکاماتِ الٰہیہ سے بہت دور جا پڑتا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ: ''یہ یعنی: ''ضلالت'' کو ''ہدایت'' کے بدلے اور ''عذاب'' کو ''مغفرت'' کے بدلے خریدنے کی دلیل، یا ان پر عذاباتِ مذکورہ سابقہ کے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے جو کتاب سچی نازل فرمائی، انھوں نے اس کے خلاف کیا اور طرح طرح کے اختلاف اس میں ڈالے اور خلاف اور دشمنی میں دور جا پڑے، یعنی بڑا خلاف کیا، یا طریقۂ حق سے دور ہوگئے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ ان کا صابر علی النّار (آگ پر صبر) ہونا، چوں کہ بدیہیُ البُطلان (واضح طور پر باطل ہونا) نظر آتا تھا، اس لیے لفظ ''ذٰلک'' سے اخیر (آیت) تک اس کے جواب کی طرف اشارہ فرمادیا۔ فافھم (اچھی طرح سمجھئے)''۔

کتمانِ علم سے متعلق سابقہ ایک آیت (159) میں انسانیت کے تہذیبِ اَخلاق سے متعلق ابراہیمی ملت کے بنیادی احکامات؛ ذکر، شکر، صبر، نماز وغیرہ سے متعلق احکامات کو چھپانے پر اللہ کی لعنت کا تذکرہ کیا گیا۔ اور اس آیت (174) میں اجتماعِ انسانیت سے متعلق کسبِ معاش اور حلال وحرام کی تمیز کیے بغیر کھانے پینے کے احکاماتِ الٰہیہ کو نظرانداز کرنے اور ایسے علم کو چھپانے پر سخت وعید اور عذاب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد؛ ملتِ ابراہیمی کے تمام ارتفاقات اور اقترابات سے متعلق علوم اور احکامات کی اہمیت کو واضح کرنا ہے، تاکہ اس کے مطابق انسان عمل کرے اور کامیاب ہو۔

www.rahimia.org



درسِ حدیث

از: مولانا ڈاکٹر محمد ناصر، جھنگ

دینی فہم وبصیرت کی فضیلت

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ؛ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ”فَقِيهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ“. (السنن لابن ماجة، 222)

(حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”شیطان پر ایک فقیہ (عالم) ہزار عابدوں سے بھاری ہے“۔

حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق ایک فقیہ، عبادت گزار کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کو ان عبادت گزاروں کی نسبت زیادہ مشکل ہوتی ہے جو دینی فہم اور شعور نہیں رکھتے۔ ایسے دینی فہم سے محروم ہزار عبادت گزار لوگوں کو وہ آسانی سے گمراہ کر لیتا ہے۔ اس حدیث میں دو بنیادی باتیں ہیں، پہلی فقاہت اور دوسری عبادت۔

فقاہت علم وحکمت اور سمجھ کا نام ہے۔ شرعی علوم میں رسوخ اور عقل وحکمت پر مبنی بصیرت افروز فہم کو فقاہت کہتے ہیں، بعض لوگوں کو اللہ کی طرف سے یہ فقہی مزاج عطا ہوتا ہے اور بعض کو فقیہ النفس لوگوں کی صحبت میں رہنے سے اس کا کچھ حصہ مل جاتا ہے اور غور وفکر کرنے کا ایک زاویہ بن جاتا ہے۔ اللہ کے تعلق کے نتیجے میں یہ انعامِ الٰہی میں سے ایک انعام ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جب کوئی زہد اختیار کر لیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی زبان پر حکمت کے کلمات جاری کر دیتے ہیں۔

عبادت کا مطلب ہے فرائض، نوافل، ذکر اذکار، صدقہ وخیرات کے ذریعے اللہ کے ساتھ تعلق اور انسان کے دل ودماغ میں خدا کی حضوری پیدا ہو جائے۔

حقیقی عبودیت یہ ہے کہ انسان ہر غیر کا انکار کرے اور ہر غیر کا خوف دل سے نکال دے جو حق بات ہے اس کو سمجھے، مانے، اس کو بیان کرے اور اس کے نتائج کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو یوں عبادت وحکمت اور عملی جدوجہد مل کر زہد کی صورت بن جاتی ہے۔ زہد کا جو معنی عام طور پر ترکِ دنیا لیا جاتا ہے، غلط ہے۔ تارکِ دنیا کو لوگ اس وجہ سے چھوڑ کے چلے جاتے ہیں کہ اس کے پیچھے چل کر تو دنیا میں ناکامی ہوگی۔ یہ گویا متروک الدنیا ہو جانا ہے کہ لوگ اس کو چھوڑ کے بھاگ گئے، اس طرح کی ترکِ دنیا کا اسلام حکم نہیں دیتا۔ جب انسان حق کہتا ہے تو دنیا پرست قوتیں اس کو قبول نہیں کرتیں۔ ایسے موقع پر جب آدمی ثابت قدم رہتا ہے اور ڈٹ جاتا ہے اور مشکل حالات کا سامنا کرتا ہے، پھر انعامِ الٰہی ہوتا ہے، ان انعامات میں سے ایک نعمت حکمت کی دولت کا ملنا ہے۔

اس حدیث مبارک میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ فقیہ وہ ہوتا ہے جو دین کو عقل ودانش، دلیل کے ساتھ سمجھتا ہے اور عصری شعور کے ساتھ عابد بھی ہوتا ہے۔ لوگوں کو ایسے علمائے ربانی کی پیروی کرنی چاہیے۔ اسی کو قرآن نے کہا کہ ایسی جماعت کیوں نہیں پیدا ہو جاتی جو فقہی بصیرت اور گہرائی حاصل کرے اور پھر یہ دینی فہم وبصیرت دوسرے لوگوں تک پہنچائے۔ (سورۃ التوبہ، 122)

صحابہؓ کا ایمان افروز کردار



مولانا قاضی محمد یوسف، حسن ابدال

حضرت سوید بن حارث ازدی رضی اللہ عنہ

حضرت سوید بن حارث ازدی رضی اللہ عنہ کا تعلق قبیلہ ازد سے تھا۔ آپؓ نے حضرت ابوذرؓ سے احادیث روایت کی ہیں اور آپؓ سے آپؓ کے پوتے علقمہ بن یزید احادیث روایت کرتے ہیں۔ آپؓ علم کی طلب وعظمت والے علاقے یمن سے تعلق رکھتے تھے اور لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے، آپؓ حضرت علیؓ کے اصحاب میں بھی شمار ہوتے ہیں۔

حضرت سویدؓ فرماتے ہیں کہ: ہماری قوم کے سات افراد رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہماری گفتگو کا انداز، وقار اور لباس آپؐ کو بہت پسند آیا۔ آپؐ نے پوچھا کہ: ”تم کون ہو؟“ ہم نے عرض کیا: ہم مسلمان اور اہلِ ایمان ہیں۔ اس پر آپؐ نے مسکراتے ہوئے دریافت فرمایا کہ: ”ہر بات کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے۔ تمھارے ایمان اور تمھاری اس گفتگو کی حقیقت کیا ہے؟“ تو ہم نے عرض کیا کہ: 15 خصلتیں ایسی ہیں جو ہم اختیار کیے ہوئے ہیں، جن میں سے پانچ باتوں پر ایمان لانے کا اور پانچ باتوں پر عمل کرنے کا آپؐ کے قاصدوں اور مبلغوں نے ہمیں بتایا ہے۔ اور پانچ باتیں ہیں، جن پر ہم زمانۂ جاہلیت۔ یعنی: قبل از اسلام۔ سے ان پر عمل کرتے آ رہے ہیں اور وہ ہماری عادتِ ثانیہ بن گئی ہیں۔ اگر وہ ناپسند ہوں تو ابھی ترک کرنے کو ہم تیار ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے پانچ یقین اور ایمان والی باتیں دریافت کیں تو ہم نے بتایا کہ:

یہ ہمیں معلوم ہوا: (1) اللہ کی ذات کی عبادت (2) اس کے فرشتوں (3) اس کے رسولوں (4) اور اس کی کتابوں اور (5) بعد از موت دوبارہ زندگی پر ایمان لانا۔ اور پانچ باتیں جن پر عمل کرنے کی تاکید ہے وہ یہ ہے کہ: (1) اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں (2) نماز کا باقاعدہ قیام (3) زکوٰۃ کی ادائیگی (4) رمضان کے روزے رکھنا (5) اور سفر کے اخراجات موجود ہوں تو بیت اللہ شریف کا حج کرنا۔ وہ پانچ باتیں جن پر ہم پہلے سے ہی عمل پیرا ہیں، وہ یہ ہیں: (1) فراخی میں شکر کرنا (2) مصیبت میں صبر کرنا (3) اللہ کی جانب سے جو مقدر چیزیں ہیں، اس پر اطمینان اور مسرت کا اظہار (4) جنگ میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا (5) دشمن کی مصیبت اور تکلیف پر ہنسی مذاق نہ اڑانا۔

حضور اکرم ﷺ نے ہماری باتیں سن کر فرمایا کہ: تم بڑے علما وحکما ہو۔ یہ تو انبیا علیہم السلام کے فکر وتدبر اور ان کے درجے کی باتیں ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”اب میں اپنی جانب سے پانچ باتوں کا اضافہ کرتا ہوں۔ یہ کل 20 ہو جائیں گی اور وہ یہ ہیں کہ: (1) اپنی ضرورت اور حاجت سے زیادہ خوراک جمع کر کے نہ رکھنا (2) ضرورت سے زیادہ مکانات رہائش گاہیں تعمیر نہ کرنا (3) جس چیز کو چھوڑ کر کل تمھیں چلے جانا ہے، اس کی حرص اور لالچ میں مبتلا نہ ہونا (4) اس اللہ کا خوف دل میں رکھنا جس کی طرف سب نے لوٹ کر چلے جانا ہے اور جس کے سامنے حساب وکتاب پیش کرنا ہے۔ (5) اس گھر (قبر) کی فکر بہت رکھنا جس میں ہمیشہ رہنا ہے“۔ چناں چہ بنی اسد کے اراکینِ وفد آپ ﷺ کی یہ حکیمانہ نصیحتیں سن کر اس یقین دہانی کے ساتھ واپس لوٹے کہ وہ ان پر عمل کرتے رہیں گے۔ (ترجمان السنہ، الاصابہ، اسد الغابہ الازدی)

www.rahimia.org



''مفکرِ پاکستان'' اور ایک صدی کی قومی ناکامی:
اقبال کے نام لیواؤں نے اقبال سے کیا سیکھا؟

برعظیم کی گزشتہ ایک صدی کی تاریخ ایک عجیب تضاد کی داستان ہے۔ اس خطے نے بڑے مفکر پیدا کیے، آزادی کی عظیم تحریکیں دیکھیں، سیاسی انقلابوں کے نعرے سنے، نئی ریاستوں کو وجود میں آتے دیکھا اور قومی خودمختاری کے بے شمار دعووں کا تجربہ کیا، لیکن اس پورے تاریخی سفر کے بعد بھی بنیادی سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ کیا یہاں کے انسان کو حقیقی آزادی، معاشی تحفظ، اجتماعی عدل اور فکری خودمختاری حاصل ہوسکی؟ کیا نوآبادیاتی اقتدار کے خاتمے کے ساتھ اس کے پیدا کردہ معاشی، سیاسی اور تہذیبی نظام بھی تبدیل ہوئے، یا اقتدار کے چہرے بدلنے کے باوجود محکومی کے بنیادی ڈھانچے نئی صورتوں میں برقرار رہے؟

نومبر کے مہینے میں سرکاری و نجی سطح پر علامہ محمد اقبالؒ کا یومِ پیدائش چند تقریروں اور نغموں کے ساتھ منایا جاتا ہے، اس نسبت سے ہمیں انھی سوالات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اقبال محض ایک شاعر نہیں تھے۔ وہ برعظیم کے نوآبادیاتی عہد میں پیدا ہونے والے فکری بحران پر نظر رکھنے والے ایک اہم ترجمان تھے۔ انھوں نے مسلمان معاشرے کے فکری جمود، سیاسی محکومی، معاشی استحصال اور تہذیبی انتشار پر سوالات اٹھائے۔ ان کی شاعری میں انقلاب کی آرزو، ان کی نثر میں فکر کی تشکیلِ نو اور ان کی سیاسی جدوجہد میں اجتماعی خودمختاری کی خواہش نمایاں ہے۔ لیکن اقبال کی وفات کے اٹھاسی برس بعد، اور برعظیم کی سیاسی تاریخ کے تقریباً ایک صدی پر محیط تجربات کے بعد، یہ سوال پوچھنا ضروری ہے کہ اس خطے کی سیاسی، مذہبی اور فکری قیادت نے اقبال کے افکار کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یہ سوال اس لیے بھی اہم ہے کہ ہمارے ہاں اقبال کی عظمت پر گفتگو تو بہت ہوتی ہے، مگر ان کے افکار کا تاریخی احتساب کم کیا جاتا ہے۔ ہم نے اقبال کو قومی شناخت کا حصہ تو قرار دے دیا، لیکن ان کے اٹھائے ہوئے سوالات کو اپنی اجتماعی زندگی کا بنیادی مسئلہ بنانے سے بڑی حد تک گریز کیا۔

اگرچہ یہ سوال پورے برعظیم کی تاریخ سے متعلق ہے، تاہم اس مضمون کا بنیادی مرکز بالخصوص پاکستان کا قومی تجربہ، اس کا ریاستی بیانیہ اور اقبال کی فکر کی بعد از قیامِ پاکستان تعبیر ہے۔

اقبال کا عہد برطانوی استعمار کے سیاسی غلبے، سرمایہ دارانہ معیشت کی توسیع اور ہندوستان کے روایتی معاشرتی ڈھانچوں میں بنیادی تبدیلیوں کا عہد تھا۔ برطانوی اقتدار نے ہندوستان میں انتظامی مرکزیت، جدید قانونی اداروں، نوآبادیاتی تعلیمی نظام اور معاشی انحصار کی نئی صورتیں پیدا کیں۔ اس کے نتیجے میں ہندوستانی معاشرہ ایک ایسے بحران سے دوچار ہوا جس میں سیاسی غلامی کے ساتھ فکری اور معاشی محکومی کے سوالات بھی شامل تھے۔ اس عہد میں اقبال نے مغربی تہذیب کی سائنسی ترقی اور علمی کامیابیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے سامراجی کردار، سرمایہ دارانہ استحصال اور مادہ پرستانہ رجحانات پر تنقید کی۔ انھوں نے مسلمانوں کے مذہبی جمود، تقلیدی ذہنیت اور ماضی پرستی کو بھی اجتماعی زوال کے اہم اسباب میں شمار کیا۔ اقبال کی فکر کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ محض ماضی کی عظمت کے قصے دہرانے کے بجائے ایک فعال، تخلیقی اور خوددار انسان کی تشکیل چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک زندگی مسلسل حرکت، جدوجہد اور تخلیقی عمل کا نام تھی، لیکن اس فکر کا سب سے بڑا امتحان یہ تھا کہ اسے اجتماعی اداروں، معاشی تعلقات اور سیاسی نظام کی تبدیلی میں کس طرح ڈھالا جائے۔ یہاں اقبال کی فکر کی ایک بنیادی حد بھی سامنے آتی ہے۔ انھوں نے فکری بیداری اور تہذیبی احیا کا نہایت طاقت ور فلسفیانہ مقدمہ قائم کیا، مگر جدید معاشرے کے معاشی، سیاسی اور انتظامی اداروں کی تشکیل کے لیے ایسا مکمل اور مربوط عملی خاکہ پیش نہیں کیا، جس میں قابلِ نفاذ پالیسیوں اور ادارہ جاتی انتظامات کی تفصیلات بھی موجود ہوں۔ خودی کا فلسفہ انفرادی قوتِ ارادی اور اَخلاقی ذمہ داری پر زور دیتا ہے، مگر ریاستی اداروں، معاشی ڈھانچے اور طبقاتی تعلقات کی تنظیم کے لیے اس کے پاس کوئی تفصیلی لائحۂ عمل موجود نہیں تھا۔ ان کی شاعری نے ذہنوں کو جھنجھوڑا، لیکن اس فکری بیداری کو منظّم اجتماعی تبدیلی میں تبدیل کرنے کا کام بڑی حد تک بعد کی سیاسی و سماجی تحریکوں پر چھوڑ دیا گیا۔

اقبال کا فلسفۂ خودی؛ انسانی شخصیت کی آزادی، ارادے کی قوت، اخلاقی ذمہ داری اور تخلیقی صلاحیت کا فلسفہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خودی کا یہ تصور معاشی اور سیاسی محکومی کے موجودہ ڈھانچوں سے الگ ہوکر اپنی حقیقی معنویت برقرار رکھ سکتا ہے؟ جس معاشرے میں عام انسان بنیادی ضروریات کے حصول کے لیے دوسروں کا محتاج ہو، جہاں تعلیم طبقاتی امتیاز کی علامت بن جائے، جہاں سیاسی فیصلوں میں عوام کی مؤثر شرکت مفقود ہو اور جہاں معاشی وسائل کی تقسیم میں شدید تر عدمِ توازن موجود ہو، وہاں خودی کا پیغام محض انفرادی حوصلہ افزائی تک محدود ہوجانے کا خطرہ رکھتا ہے۔

ہماری قومی تاریخ میں یہی المیہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ہم نے خودی کے اشعار کو تقریروں کا حصہ بنایا، لیکن خوددار انسان کی تشکیل کے لیے درکار اجتماعی حالات پیدا نہ کرسکے۔ ہم نے نوجوانوں کو بلند پروازی کا درس دیا، مگر ان کے لیے علم، تحقیق، باعزت روزگار اور تخلیقی صلاحیتوں کے فروغ کا مؤثر نظام قائم کرنے میں ناکام رہے۔ خودی کا فلسفہ جب معاشی انصاف اور اجتماعی آزادی سے غیر متعلق ہوجائے تو وہ اپنی انقلابی قوت کھو کر ایک جذباتی نعرہ بن سکتا ہے۔ اقبال کی فکر کے ساتھ اس سے بڑا المیہ کیا ہوگا کہ خودی کی تعلیم پانے والے معاشرے میں شخصیت پرستی، اقتدار پرستی، سفارش، طبقاتی بالادستی اور فکری غلامی مختلف صورتوں میں برقرار رہیں!

www.rahimia.org

اقبال کے تصورِ ملت نے برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی شناخت اور اجتماعی خودمختاری کے مباحث پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ 1930ء کے خطبۂ الٰہ آباد میں انھوں نے شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں کو ایک سیاسی وحدت میں منظم کرنے کی تجویز پیش کی۔ تاہم یہ بھی واضح رہے کہ اس تصور کو 1947ء کی ریاست کے مکمل اور پہلے سے طے شدہ نقشے کے مترادف قرار دینا تاریخی طور پر درست نہیں۔ اقبال کی سیاسی فکر میں مسلم اجتماعیت، تہذیبی شناخت اور سیاسی خوداختیاری کے تصورات نمایاں تھے، لیکن ان تصورات کی عملی تعبیر کے متعلق متعدد سوالات موجود تھے۔

اقبال کے سیاسی تصورات اور قیامِ پاکستان کے بعد تشکیل پانے والے قومی بیانیے کے درمیان اختلاف کی ایک نہایت اہم تاریخی شہادت خود اقبال کی مراسلت میں موجود ہے۔ 1930ء کے معروف ''خطبۂ الٰہ آباد'' کو بعد میں پاکستان کے قیام کی پہلی واضح تجویز کے طور پر پیش کیا گیا تو اقبال نے اپنے عہد میں اس تعبیر کی صراحتاً تردید کی تھی۔ 12/اکتوبر 1931ء کو لندن کے اخبار ''دی ٹائمز'' میں شائع ہونے والی وضاحت میں انھوں نے اپنے تصور کو برطانوی سلطنت سے باہر ایک آزاد مسلم ریاست کے فوری سیاسی مطالبے سے الگ قرار دیا۔ اس کے بعد 4/مارچ 1934ء کو ایڈورڈ جان تھامسن کے نام خط میں انھوں نے دوٹوک الفاظ میں لکھا کہ: ''پاکستان'' کا مجوزہ منصوبہ ان کی اسکیم نہیں ہے۔ ان کی تجویز شمال مغربی ہندوستان میں مسلم اکثریتی سیاسی وحدت کی تشکیل تھی جو مجوزہ ہندوستانی وفاق کا حصہ ہوتی، جب کہ کیمبرج میں پیش ہونے والی پاکستان اسکیم ہندوستانی وفاق سے الگ مسلم صوبوں کی وفاقی تنظیم کی تجویز تھی۔ محض دو دن بعد، 6/مارچ 1934ء کو مولانا راغب احسن کے نام خط میں بھی اقبال نے اسی فرق کو واضح کیا اور اس غلط نسبت کی اصلاح پر زور دیا۔

یہاں ایک تاریخی وضاحت ضروری ہے کہ اقبال نے اپنے تصور اور بعد میں کیمبرج میں پیش کی جانے والی ''پاکستان اسکیم'' کے درمیان فرق واضح کیا تھا۔ اس وضاحت کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مسلم اکثریتی علاقوں کی کسی امتیازی سیاسی وحدت کے مخالف تھے، بلکہ وہ اپنی تجویز اور بعد کی مخصوص پاکستان اسکیم کو دو مختلف سیاسی منصوبے قرار دے رہے تھے۔

یہ تاریخی شہادتیں اس لیے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں کہ ان کی موجودگی میں اقبال کے 1930ء کے تصور کو بلا کسی توضیح کے 1947ء میں قائم ہونے والی ریاست کے مکمل نقشے کے طور پر پیش کرنا علمی دیانت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔ تاہم ان خطوط سے یہ نتیجہ نکالنا بھی درست نہیں کہ اقبال ہر زمانے اور ہر صورت میں ایک آزاد مسلم ریاست کے تصور کے مخالف تھے۔ ان کی سیاسی فکر میں مختلف ادوار کے دوران وفاق، مسلم خوداختیاری اور مستقبل کے ممکنہ سیاسی انتظامات پر غور و فکر جاری رہا۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ ان کے مختلف بیانات کو ان کے تاریخی سیاق میں سمجھا جائے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سرکاری نصاب اور قومی تقریبات میں اقبال کو یک طرفہ طور پر ''مفکرِ پاکستان'' بنا دیا گیا اور ان کے ان خطوط کو تقریباً نظرانداز کر دیا گیا، جس سے تاریخی حقیقت کی بجائے ریاستی ضرورت کے مطابق ایک سادہ داستان تشکیل دی گئی۔

یہاں ہمارا بنیادی سوال اقبال کی عظمت یا ان کی قومی تشکیل کی فکر کا انکار نہیں، بلکہ اس تاریخی عمل کا محاسبہ ہے جس میں ایک مفکر کے پیچیدہ، ارتقا پذیر اور قابلِ بحث سیاسی تصورات کو بعد کی ریاستی ضروریات کے مطابق ایک سادہ اور غیر متنازع قومی داستان میں تبدیل کر دیا گیا۔ جب تاریخ کو تحقیق کے بجائے قومی تقدیس کا موضوع بنا دیا جائے تو قومیں اپنے ماضی سے سبق حاصل کرنے کے بجائے اپنے ہی بنائے ہوئے تصورات کی اسیر ہو جاتی ہیں۔

برصغیر کی تقسیم نے 1947ء میں دو آزاد ریاستوں کو جنم دیا، لیکن سیاسی آزادی کے ساتھ تقسیم کی ہولناک انسانی قیمت بھی ادا کرنا پڑی۔ لاکھوں انسان قتل و غارت اور نقل مکانی کی تباہ کاریوں سے متاثر ہوئے، قدیم معاشرتی رشتے ٹوٹے اور مذہبی شناختیں شدید سیاسی کشمکش کا مرکز بن گئیں۔ اس کے بعد پاکستان کی تاریخ نے ایک اور تلخ حقیقت آشکار کی۔ 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علاحدگی نے ثابت کیا کہ مشترکہ مذہبی شناخت بذاتِ خود معاشی انصاف، سیاسی مساوات، لسانی حقوق اور قومی وحدت کی ضمانت نہیں بن سکتی۔ یہاں اقبال کے تصورِ ملت اور اس کی بعد کی سیاسی تعبیرات کے درمیان فرق کرنا ضروری ہے۔ اقبال کو بعد کے تمام تاریخی واقعات کا ذمہ دار قرار دینا درست نہیں، لیکن ان کے سیاسی تصورات کو تاریخی نتائج کی روشنی میں تنقیدی جانچ سے مستثنیٰ قرار دینا بھی علمی دیانت کے منافی ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا کسی معاشرے کی اجتماعی وحدت صرف مذہبی شناخت کی بنیاد پر پائیدار ہو سکتی ہے، یا اس کے لیے مشترکہ معاشی مفادات، سیاسی مساوات، شہری حقوق اور عادلانہ اجتماعی اداروں کی تشکیل بھی ناگزیر ہے؟ برصغیر کی گزشتہ ایک صدی کی تاریخ اس سوال کو نظرانداز کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

اقبال کی فکر کا ایک نہایت اہم پہلو اسلام کی زندہ اور متحرک فکری روایت کا احیا ہے، جس میں مستقل اصولوں اور بدلتے ہوئے تاریخی حالات کے درمیان تخلیقی تعلق قائم ہونا چاہیے۔ انھوں نے اجتہاد کو اسلامی نظام میں حرکت کا بنیادی اصول قرار دیا اور علمی جمود کو مسلمانوں کے زوال کا ایک اہم سبب سمجھا۔ لیکن اقبال کی اس دعوت کا عملی نتیجہ کیا نکلا؟ ہمارے تعلیمی اداروں میں اقبال کے اشعار یاد کرائے جاتے ہیں، مگر ان کے فلسفیانہ سوالات پر آزادانہ بحث کی روایت کمزور ہے۔ مذہبی حلقوں میں ان کی عظمت تسلیم کی جاتی ہے، مگر اجتہاد، مذہبی فکر کی تشکیلِ نو اور جدید اجتماعی مسائل پر ان کے تصورات کو اکثر رسمی گفتگو تک محدود رکھا جاتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جس مفکر نے تقلیدی جمود کو چیلنج کیا، ہم نے خود اسی کی فکر کو ایک نئی تقلیدی روایت میں تبدیل کر دیا۔ اقبال کے ساتھ علمی وفاداری کا تقاضا ان کے ہر قول کی غیر مشروط تائید نہیں، بلکہ ان کے افکار کا تنقیدی مطالعہ، ان سے اختلاف کی آزادی اور ان کے اٹھائے ہوئے سوالات پر نئی تحقیق ہے۔ بقیہ: صفحہ 11 پر

www.rahimia.org

مجبور محنت کش کی رضامندی، حقیقی رضامندی نہیں

مترجم: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''حُجّۃُ اللّٰہِ البالِغہ'' میں فرماتے ہیں:

''اگر یہ مالی ترقی ایسے طریقے سے کی جائے کہ اس میں سرے سے تعاون کا کوئی دخل ہی نہ ہو، جیسا کہ قمار (جُوّا، سٹہ) کا کاروبار یا ایسا طریقۂ کار اختیار کیا جائے کہ بہ ظاہر تو تعاون نظر آتا ہو، لیکن حقیقت میں وہ زبردستی کا تعاون ہو، حقیقی تعاون نہ ہو، جیسا کہ مثلاً رِبا (سود) کا کاروبار، اس لیے کہ یہ بات بہت صاف ہے کہ ایک مفلس اور نادار اپنی معاشی پریشانیوں کی وَجہ سے اپنے ذمہ ایسی ذمہ داریوں کو لینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے، جن کو پورا کرنے کی اپنے میں طاقت نہیں پاتا۔ تو ایسی صورت میں مجبور محنت کش کی رضامندی، حقیقی رضامندی نہیں ہے۔

پس اس طرح کے کاروبار نہ پسندیدہ ہیں اور نہ ہی جائز معاملات کہلائے جاسکتے ہیں اور نہ ان کو معاشیات میں رزق حاصل کرنے کے صحیح اسباب کہا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ اس قسم کے تمام معاملات حکمتِ تمدن کی نگاہ میں باطل اور ظلم ہیں۔

(انسانی مِلکیت کا مطلب اور مفہوم)

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: ''جس نے کسی مردہ زمین کو آباد کیا، وہ اُس کی ہے''۔ (مشکوٰۃ، حدیث: 2944) مَیں (شاہ ولی اللہ دہلوی) کہتا ہوں کہ: اس میں اصل اُصول وہ ہے، جس کی طرف ہم نے پیچھے اشارہ کیا ہے کہ زمین کے تمام وسائل اللہ کا مال ہیں۔ حقیقت میں کسی ایک آدمی کا اس میں حق نہیں ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کے لیے زمین اور اُس میں موجود معاشی وسائل کو مباح قرار دیا تو لوگوں کے درمیان جھگڑے پیدا ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کا حکم اس وقت یہ ہوا کہ کوئی آدمی، دوسرے کی پہلے سے کی ہوئی محنت میں جو بغیر کسی کو نقصان پہنچائے ہو، اُس میں دخل اندازی نہ کرے۔

مردہ زمین وہ ہے، جو نہ شہری آبادی میں ہے، نہ شہری اجتماعی ضروریات سے متعلق ہے، جب کسی آدمی نے بغیر کسی کو نقصان دیے ہوئے اُسے آباد کر لیا تو اس کا اس پر قبضہ ہو گیا۔ اب اس زمین کا حکم یہ ہے کہ کوئی دوسرا اُس سے نہ اُلجھے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام کی تمام زمین مسجد کی طرح ہے، یا اُس سرائے کی طرح ہے، جو مسافروں کے لیے وقف کیا گیا ہے اور ان دونوں جگہوں کے استعمال کرنے میں تمام انسان شریک ہوتے ہیں۔ بس جو پہلے آکر بیٹھ گیا، سو اپنی ضروریات وحاجات کی تکمیل تک اُس کے ہاتھ کو سبقت حاصل ہے۔ اور آدمی کے حق میں مِلکیت کا معنی یہ ہے کہ وہ دوسرے آدمی کے مقابلے پر اُس جگہ سے نفع اُٹھانے کا زیادہ حق دار ہے۔

(قدیم بنجر زمین اللہ اور اُس کے رسول کی ہے)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''عَادِیُ الأرض'' (قدیم بنجر زمین) اللہ اور اس کے رسول کی مِلکیت ہے، پھر وہ میری طرف سے تمھارے لیے ہے''۔

(مشکوٰۃ، حدیث: 303)

(''عادِیُ الأرض'' لغوی طور پر اُس زمین کو کہتے ہیں، جو قومِ عاد کے زمانے میں آباد تھی۔ اُن کی تباہی کے بعد جو زمین زمانہ گزرنے سے بالکل بے آباد اور بنجر بن چکی ہے، یعنی قدیم بنجر بے آباد زمین کو عرب لوگ ''عَادِیُ الأرض'' کہتے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے آئندہ جملوں میں اس کی اصطلاحی تعریف بیان کی ہے:)

علمی طور پر جان لینا چاہیے کہ ''عَادِیُ الأرض'' وہ زمین ہے جس کے باشندے وہاں سے چلے گئے ہوں، اور کوئی ایسا باقی نہ رہا ہو جو اس پر دعویٰ کرے، یا اس میں جھگڑا کرے، یا اپنے مورث کی سابقہ مِلکیت کا حوالہ دے کر دلیل پیش کرے۔ پس جب زمین اس صفت پر ہو، تو اس سے آدمیوں کی مِلکیت منقطع ہو جاتی ہے، اور وہ خالصتاً اللہ کی مِلکیت بن جاتی ہے، اور اس کا حکم اس چیز کا سا ہوتا ہے جسے کبھی آباد نہیں کیا گیا، مِلکیت کے اُس معنی کی بنا پر، جو ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ (یعنی: آدمی کے حق میں مِلکیت کا معنی یہ ہے کہ وہ دوسرے آدمی کے مقابلے پر اُس جگہ سے نفع اُٹھانے کا زیادہ حق دار ہے۔)

(اچھی اور عمدہ زمین پر سرداروں اور حکمرانوں کا قبضہ ناجائز ہے)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی کے لیے کوئی ''حِمٰی'' (چراگاہ) مخصوص نہیں ہے''۔ (رواہ البخاری، حدیث: 3012)

(''حِمٰی'' کا مطلب فقہ کی کتابوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایسی اجتماعی زمین جہاں لوگ اپنے جانوروں کو چرانے کے لیے اُسے اپنے لیے مخصوص کر لیں۔ جاہلیت کے زمانے میں قوم کے سردار اور حکمران طبقہ عمدہ اور سرسبز دِکھنے والی جگہ کو اپنے جانوروں کے چرانے کے لیے مخصوص کر لیتے تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے اسے باطل قرار دے دیا۔)

مَیں (شاہ ولی اللہ دہلوی) کہتا ہوں کہ:

چوں کہ ''حِمٰی'' (مخصوص چراگاہ) عام لوگوں کے لیے تنگی کھڑی کرنا ہے اور ان پر ظلم کرنا اور انھیں نقصان پہنچانا ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس سے روک دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس سے مستثنیٰ اس لیے کیا گیا کہ اللہ نے انھیں میزانِ عدل عطا فرمایا ہے، اور انھیں اس بات سے محفوظ رکھا ہے کہ ان سے کوئی ایسی چیز سرزد ہو جو جائز نہ ہو۔ (حِمٰی کے اللہ اور اُس کے رسول کے لیے ہونے کا مطلب ریاست اور اجتماعیت کی مِلکیت میں ہونا ہے۔)

ہم نے (گزشتہ قسمِ اول کی چھٹی مبحث کے تیرہویں باب میں) ذکر کیا ہے کہ وہ امور جن کی بنیاد غالب گمانوں پر ہے، ان سے نبی ﷺ کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے، اور وہ امور جن کی بنیاد نفس کی تہذیب اور اس جیسی چیزوں پر ہے، تو ان میں نبی ﷺ اور دوسروں سب کے لیے حکم یکساں لازم ہے''۔

(حجۃ اللہ البالغہ، من ابواب ابتغاء الرزق)

www.rahimia.org



خطبات و بیانات

رپورٹ: سیّد نفیس مبارک ہمدانی، لاہور

حقیقتِ ایمان اور اس کے بنیادی ارکان

2/اکتوبر 2026ء کو حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہ نے ادارہ رحیمیہ لاہور میں خطبہ جمعہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''معزز دوستو! کتابِ مقدس قرآنِ حکیم کے پیغامِ انسانیت کے آغاز ہی میں اس حقیقت کی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ اس کتابِ مقدس کے فکر و عمل اور بنیادی حقائق میں کسی بھی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ دنیا اور آخرت میں کامیابی، عدل و انصاف کا نظام اور تقویٰ حاصل کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ انسان صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ اور اس کے دیے ہوئے پیغام کو سمجھے اور اس پر ایمان لائے۔ یہ پیغام دل و دماغ میں راسخ ہونا چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایمان کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے ابن ماجہ کی روایت میں فرمایا کہ: ''ایمان؛ دل کی معرفت، زبان سے اقرار اور اعضائے بدن سے عمل کا نام ہے''۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث: 65) انسان کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس کائنات کا خالق و مالک ایک اللہ رب العزت ہے، اسی نے اپنے رسول ﷺ کو دنیا میں انسانی ہدایت کے لیے بھیجا ہے، اور کائنات کا نظام اللہ کے حکم سے چل رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس زمین پر اللہ کے خلیفہ اور پیغمبر ہیں، اور ان کی دی ہوئی ہدایات پر دل کی صداقت سے ایمان لانا ضروری ہے۔ ایمان کی بنیادی حقیقت میں درج ذیل امور شامل ہیں:

1۔ اللہ پر ایمان: جو اس کائنات کا اکیلا خالق و مالک ہے۔

2۔ ملائکہ پر ایمان: اللہ تعالیٰ نے کائنات کا نظام چلانے کے لیے جو فرشتے (خواہ وہ ملاءِ اعلیٰ ہوں یا ملاءِ سافل) مقرر کر رکھے ہیں، جو تمام امور اللہ کے احکامات کے مطابق انجام دیتے ہیں، ان پر یقین رکھنا۔

3۔ کتابوں پر ایمان: تخلیقِ کائنات کے ساتھ انسانیت کی ترقی کا جو پروگرام لوحِ محفوظ میں مقرر کیا گیا اور جو کتابیں ہر نبی پر اپنے اپنے دور میں نازل ہوتی رہیں، ان تمام کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لانا۔

4۔ رسولوں پر ایمان: حضرت آدمؑ سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک تمام انبیا اور رسولوں پر ایمان لانا، جو انسانیت کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے۔ رسول پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ جو رسول حکم دے اسے کرو اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔

5۔ آخرت کے دن پر ایمان: ایک ایسے آخری دن پر ایمان لانا جس کے بعد کوئی دن نہیں ہوگا۔

6۔ تقدیر پر ایمان: اس پورے نظامِ تقدیر پر ایمان لانا۔ جس طرح زمین میں ٹھہراؤ ہے، اسی طرح انسان کا بھی ایک تقدیری نظام ہے؛ اس کا جسم، ساخت، آواز، لہجہ، کام کرنے کا انداز اور روح اپنا ایک نظام اور طے شدہ ضابطے رکھتی ہے۔

ایمان کے ان بنیادی ارکان کو اپنے افکار و اعمال کی بنیاد بنانا ضروری ہے''۔

ایمان؛ تصدیقِ قلبی سے عملی زندگی تک

حضرت آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے مزید فرمایا:

''ایمانیات سب سے پہلے دل کی حقیقت اور معرفت پر مبنی ہوتی ہیں، جسے معرفتِ خداوندی، کائنات، فرشتوں، کتابوں، رسولوں، قیامت اور آخرت کے دن کی شناخت کہا جاتا ہے۔ ان تمام پر سب سے پہلے دل سے معرفت اور عرفان حاصل کرنا ضروری ہے، کیوں کہ اگر دل کی تصدیق نہیں ہے تو وہ ایمان نہیں کہلا سکتا، اور ''تصدیق بالقلب'' پہلا مرحلہ ہے۔ انسان اس راستے پر چلتا ہے تو اس کی معرفت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو کچھ ضمیر اور دل کے اندر موجود ہے، اسی کے مطابق زبان سے اس کا اقرار کرنا بھی لازمی ہے، جسے ''اقرار باللّسان'' کہتے ہیں۔ زبان سے بھی اس کا اقرار کر؛ کیوں کہ دنیا میں انسان کے تمام سماجی معاہدات، عمرانی تقاضے وہ زبان سے وابستہ ہیں۔ دل کی بات کو کون جانتا ہے؟ کسی کا دل چیر کر نہیں دیکھا جا سکتا کہ اس کے دل میں تصدیق ہے یا تکفیر ہے، ایمان ہے یا کفر ہے۔ تصدیق کے لیے ضروری ہے دلی تصدیق کے بعد زبان سے اس کا اقرار کرے۔ کیوں کہ انسان کے تمام سماجی معاہدات؛ نکاح ہو، خرید و فروخت ہو، سوسائٹی کی اجتماعیت ہو، حکومت اور ریاست ہو، قومی نظام ہو، ہر ایک کے لیے زبان سے لین دین، خرید و فروخت، ایجاب و قبول کرنا ضروری ہے۔ جو کچھ دل میں ہے اس کو زبان سے بھی ظاہر کرنا ضروری ہے۔

تیسری اہم ترین بات یہ ہے کہ دل کی تصدیق اور زبان کے اقرار کے بعد، جو معاہدہ اللہ سے ہو چکا ہے، اسے اپنے اعضاء اور جسم سے عمل کی صورت میں بھی ظاہر کیا جائے، جسے ''عمل بالارکان'' کہتے ہیں۔ انسان جو اللہ پر ایمان لایا ہے، وہ اللہ کی عبادت کرے، نماز پڑھے اور اس میں قرآن و سورۃ فاتحہ پڑھے۔ نماز پڑھنے کا یہ طریقہ کار رسول اللہ ﷺ اور فرشتوں (جو عرش کے چاروں طرف عبادت میں مصروف رہتے ہیں) کا اختیار کردہ ہے، اس لیے ہم بھی ان کی نقل اتارتے ہوئے عبادت کریں۔ جس طرح فرشتوں اور نبی نے اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر قیام کیا، کمر جھکا کر عجز و انکساری کا اظہار کیا (سبحان ربی العظیم کہا)، اور ماتھا و ناک زمین پر رکھ کر سجدہ کیا (سبحان ربی الاعلیٰ کہا)، اسی طرح اعضاء کے ساتھ یہ تمام اعمال کیے جائیں۔

اس کے علاوہ خانہ کعبہ کا طواف، ایک مہینے کے روزے، زکوٰۃ کا قانون، سیاسی نظام، معاشی ہدایات اور ریاست کا قیام بھی اسی ایمان کا حصہ ہیں جو نبی ﷺ نے کیے اور جنہیں اعضا کے ساتھ عمل میں لایا گیا۔ ایمان صرف یہ نہیں ہے کہ زبان سے اقرار کر لیا جائے اور دل اس کے خلاف منافقت رکھے، اور نہ ہی ایمان یہ ہے کہ زبان سے اقرار تو ہو لیکن اعضاء اور ارکان اس معاہدے کے مطابق عمل نہ کر رہے ہوں، کیوں کہ عمل نہ کرنا نفاق کہلاتا ہے''۔

www.rahimia.org

نفاق کی حقیقت، اقسام اور علامات

حضرت آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے مزید فرمایا:

’’سورۃ البقرہ کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے دو جماعتوں (صاحبانِ ایمان اور کفار) کا ذکر کرنے کے بعد ایک اہم ترین تیسری جماعت یعنی منافقین کی خرابی کا تذکرہ کیا ہے۔ ایمان اور کفر کے لیے بالترتیب چند آیات نازل ہوئیں، جب کہ منافقت کی بیماری اور ان کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے سورۃ البقرہ میں تیرہ آیات نازل کی گئی ہیں، جو اس مرض کی سنگین نوعیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے کہ منافق زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان لائے، لیکن حقیقت میں وہ مؤمن نہیں ہوتے۔

مفسرین کے مطابق نفاق کی دو قسمیں ہیں:

1۔ نفاقِ اعتقادی: اس کا تعلق دل اور قول کے تضاد سے ہے۔ دل سے انسان اللہ کا انکار کرتا اور منکر ہوتا ہے لیکن زبان سے ایمان کا اقرار کرتا ہے۔ اس اعتقادی نفاق کی وجہ سے دل کا مرض بڑھ جاتا ہے اور قرآن کے مطابق ایسے منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے (الدرک الأسفل) میں ہوں گے، کیوں کہ عقیدے کے اعتبار سے وہ کافروں سے بھی بدتر اور زیادہ نقصان دہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایسے منافقوں کی نشان دہی فرما دی گئی تھی اور حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کو چالیس منافقوں کی فہرست لکھوائی گئی تھی، جن میں عبداللہ بن اُبی سرِفہرست تھا۔

2۔ نفاقِ عملی: اس کا تعلق قول اور عمل کے تضاد سے ہے۔ اس میں انسان دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار تو کرتا ہے اور معاہدہ کرتا ہے، لیکن اس معاہدے کے مطابق عمل نہیں کرتا۔

رسول اللہ ﷺ نے نفاقِ عملی کی چار علامات بیان فرمائی ہیں، جن میں سے جو شخص ان خصلتوں کا حامل ہو، وہ ان کے تناسب سے منافق کہلاتا ہے، اور اگر چاروں پائی جائیں تو وہ خالص منافق ہوتا ہے:

1۔ جب بھی بولے تو جھوٹ بولے۔

2۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

3۔ جب کوئی معاہدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی اور غداری کرے۔

4 جب جھگڑا کرے تو فجور اور گالی گلوچ پر اتر آئے، اپنے قصور کو چھپانے کے لیے قانون شکنی کرے اور سماجی ڈسپلن کو توڑے، کیوں کہ جھوٹ، خیانت اور غداری کا لازمی نتیجہ جھگڑے کی صورت میں نکلتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ منافق اس خام خیالی میں رہتے ہیں کہ وہ اللہ یا مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں، حال آں کہ وہ دراصل خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہوتے ہیں۔ دنیاوی اور کاروباری مفادات کے تحت منافقانہ رویہ اپنانے والے اس تجارت میں کوئی نفع حاصل نہیں کرتے، کیوں کہ منافقت کا یہ سودا زیادہ دیر نہیں ٹکتا اور حقیقت آخر کار کھل کر سامنے آجاتی ہے‘‘۔

برصغیر میں سیاسی غداری اور نفاق کا منفی کردار

حضرت آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے مزید فرمایا:

’’آج کے دور میں دنیا پچھلے تین سو سال سے منافقت کا شکار چلی آرہی ہے۔ سرمایہ دارانہ عالم اور یہود و عیسائی صہیونی طاقتیں مذہب، تورات، انجیل یا قرآن کی آڑ لے کر اور تجارتی مفادات کے نام پر انسانی سوسائٹی میں بغاوت پیدا کرنے کے لیے منافقانہ کردار ادا کر رہی ہیں۔ یورپ میں مرکنٹائلزم (نظریۂ زر) اور تجارت کے نام پر برطانوی و یورپی طاقتوں (جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی) نے بظاہر عیسائیت اور کاروبار کا لبادہ اوڑھ کر اپنی ریاستوں کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں غداری اور منافقت پھیلائی، خلافتِ عثمانیہ اور مغل حکومت کے ساتھ معاہدے کیے، لیکن دراصل ان کا مقصد زمینوں پر قبضہ کرنا اور ملکوں کو یرغمال بنانا تھا۔ ان میں منافقت کی وہ چار علامات پائی جاتی ہیں، جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں؛ یعنی جب بھی بولیں جھوٹ بولیں، جب کسی کے پاس مالی یا انتظامی امانت رکھی جائے خیانت کریں، جب معاہدہ کریں تو غداری کریں، اور سوال پوچھنے پر جھگڑے اور فجور پر اتر آئیں۔

برصغیر پاک و ہند میں بھی مغل سلطنت کا تختہ الٹنے کے لیے اندرونی طور پر منافقین اور نام نہاد کلمہ گو مسلمانوں (جیسے میر جعفر، میر صادق، مولوی رجب علی اور مولوی حکیم احسن اللہ خان وغیرہ) کو ملا کر غداری کے دروازے کھولے گئے، جو 1857ء تک جاری رہی۔ انگریزوں کے تسلط کے زمانے میں پہلے افراد کو غدار بنایا گیا، پھر ٹیپو سلطان کو شکست دینے کے لیے نظام حیدرآباد جیسی منافق ریاستیں پیدا کی گئیں، غدار راجے اور نواب بنائے گئے، اور سیاست، بیوروکریسی اور تعلیم میں نفاق پر مبنی پارٹیاں اور جماعتیں کھڑی کی گئیں۔

اس لیے جیسے ایک فرد منافق، مؤمن یا کافر ہوتا ہے، اسی طرح کوئی شہر، جماعت، قوم اور پوری ریاست بھی منافق یا مؤمن ہوسکتی ہے۔ محض زبانی دعویٰ کر دینا یا کسی خطے کو نام نہاد ’’دارالاسلام‘‘ کہہ دینا کافی نہیں ہے۔ اگر وہاں عملی طور پر اسلام کے احکامات نافذ نہ ہوں؛ ایسی ریاستیں دراصل ’’منافق دارالاسلام‘‘ کہلاتی ہیں۔ معرفت کا تعلق محض رٹے ہوئے علم سے نہیں، بلکہ دل کی اس کیفیت اور شرحِ صدر سے ہے جو عقل، عشق اور نفس پر کنٹرول کے ذریعے انسان کو ایک پیج پر لے آتی ہے، اور یہی کیفیت افراد سے لے کر ریاستوں تک ہوتی ہے۔

آج کے دور میں جب ہر طرف منافقانہ جماعتیں اور مفاد پرست سیاست موجود ہے، سورت البقرہ کی تیرہ آیات کے آئینے میں اپنے حالات کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے۔ پاکستان جیسے خطے میں جہاں کھلم کھلا کافر موجود نہیں ہیں، وہاں منافقت کے اس پورے کردار کو سمجھ کر اپنے اعمال کو درست کرنے اور معرفتِ قلب، قولِ لسان اور عملِ ارکان پر عمل پیرا ہو کر اپنی سوسائٹی کی اصلاح کرنے کی اشد ضرورت ہے‘‘۔

www.rahimia.org

مفتی محمد اشرف عاطف، لاہور

سلطان سلیمان اعظم
کی قانونی اصلاحات اور دفاعی اقدامات

سلطان سلیمان کو ''سلیمانِ قانونی'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس لقب کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے پہلے سے موجودہ قوانین کی ترتیب و تنظیم کی اور باقاعدہ جامع انداز میں مرتب کیا۔ انھوں نے شرعی قوانین کے برعکس کوئی قانون نہیں بنایا۔ قوانین کو مرتب کرنے میں شیخ الاسلام ابوالسعود آفندی کا کردار بہت اہم تھا۔ تمام قوانین کا مدار قرآن وسنت اور فقہ حنفی پر تھا۔ فوج کے لیے قوانین وضع کیے گئے۔ ترک فوج تنظیم اور ساز وسامان کے اعتبار سے یورپین افواج سے بہت آگے تھی۔ یورپی مؤرخ ''کریسی'' کے بقول سلیمان کی اپنی افواج کے جسمانی آرام اور اخلاقی نگرانی پر ہمہ وقت توجہ ہوتی تھی۔ اسی طرح غیر مسلم رعایا کے لیے جو قوانین وضع کیے گئے اور ان کا نفاذ ہوا' اس سے سلطان سلیمان کی رواداری، روشن خیالی اور تدبّر کا وصف نمایاں ہوتا ہے۔ علم کی ترقی کے حوالے سے آلِ عثمان سلاطین کا ایک خاص امتیاز رہا ہے۔ اپنے اجداد کی اُسی روش پر چلتے ہوئے سلطان سلیمان نے بہت سے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ اہلِ علم کی سرپرستی کی۔ وہ خود بھی صاحبِ علم تھا اس لیے اہلِ علم کا بہت بڑا قدر دان تھا۔ اس نے خود بھی بہت سی کتب تصنیف کیں۔ شعروشاعری کا ذوق اس پر مستزاد تھا۔ دورانِ جنگ روزمرہ کے واقعات قلم بند کرتا۔ اُس کے ان روزنامچوں سے اس کی فرض شناسی اور جفاکشی کا پتہ چلتا ہے۔

مسلمانوں کے حوالے سے حفاظتی اقدامات: پندرہویں اور سولہویں صدی میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان سپین اور پرتگال سے پہنچا۔ سپین پر اُموی مسلمانوں کی حکومت تھی تو اسی طرح پرتگال بھی بنواُمیہ کی حکومت کے زیرِ نگین تھا۔ لیکن جب مسلمان حکمرانوں کی باہمی نااتفاقی سے سپین پر ان کی حکومت کا آفتاب زوال پذیر ہوا تو سپین کی عیسائی حکومت نے اسلام دشمنی کا بھیانک عمل شروع کیا تو پرتگال بھی اسلام دشمنی میں سپین کے ساتھ تھا۔ مسلمانوں کو عیسائی بنانے، ملک بدر کرنے، معاشی طور پر نقصان پہنچانے حتیٰ کہ موت کے گھاٹ اُتارنے تک سے بھی دریغ نہیں کیا۔ معاشی نقصان پہنچانے کے حوالے سے مؤرخین لکھتے ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ، مشرقِ بعید اور وسطِ ایشیا کے ممالک سے عرب بحری راستے کے ذریعے تجارت کرتے تھے۔ ان کے تجارتی جہاز بحرِ ہند، بحرِ عرب، خلیجِ فارس اور بحرِ احمر کے تجارتی راستوں پر سفر کرتے۔ عرب تاجر چین، ہندوستان اور ایران وغیرہ سے مال اُٹھاتے اور مصر پہنچاتے۔ وہاں سے یورپ خصوصاً جنیوا اور وینس کے تاجر مال خرید کر یورپ کی منڈیوں میں لے جاتے تھے۔ اسی طرح یورپ کا مالِ تجارت عرب کے جہازوں پر ہندوستان، چین، ایران اور دیگر مشرقی ممالک میں پہنچتا تھا۔ اس سے مسلمانوں خصوصاً عربوں کو بہت فائدہ ہوتا۔ لیکن جب واسکوڈے گاما نے رأس امید (جنوبی افریقا) کے راستے سے ہندوستان پہنچنے کا راستہ دریافت کیا تو پرتگیزیوں نے کوشش کی کہ جس طرح ممکن ہو عربوں سے اس تجارت کو چھینا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس کو سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب ''خلافتِ عثمانیہ'' میں یوں تحریر کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ: اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پرتگیزیوں نے عرب جہازوں پر حملے شروع کیے۔ وہ عرب، حبش، ہندوستان اور ایران کے ساحلی مقامات پر حملے کرتے اور غیر مسلم تاجروں کو مجبور کرتے کہ وہ عرب تاجروں کے ہاتھ اپنا سامانِ تجارت فروخت نہ کریں۔ مالابار کے موپلہ تاجروں پر بڑی زیادتیاں کیں۔ یمن اور حجاز کے ساحلی شہروں پر قبضہ کیا اور ہندوستان میں سندھ سے لے کر مدراس، گجرات اور بمبئی تک کی بندرگاہوں پر حملے کیے۔ ساحلوں اور جزیروں میں مسلمانوں کا قتلِ عام کیا، مسجدیں توڑ کر کلیسا بنائی گئیں، کالی کٹ کے راجہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو عرب آنے جانے سے روک دیں اور پھر عرب کے ساحلوں پر خلیج عدن، آبنائے ہرمز وغیرہ کو اور ہندوستان کے ساحلوں میں سے گواء جیول، دیپ، دمن وغیرہ کو تاخت وتاراج کیا۔ ۹۱۵ھ میں ''کالی کٹ'' پر حملہ کر کے شہر کو لوٹ لیا اور وہاں کی جامع مسجد کو جلا کر خاکِ سیاہ کر دیا۔ حج پر جانے والے مسافر بھی ان قزاقوں کے ہاتھوں محفوظ نہ تھے۔ جدہ اور عدن پر کئی حملے کیے، کبھی کامیاب ہوئے اور کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ غرض یہ کہ پرتگالی یہ خواب دیکھنے لگے تھے کہ جدہ پر قبضہ کر کے حجاز پر حملہ آور ہوں اور پھر نعوذ باللہ مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کو ویران کر دیں۔ حرمین محترمین کو منہدم کر دیا جائے۔ یہ حالات تھے جن کو دیکھتے ہوئے سلطان سلیمان نے ذمہ داری محسوس کی۔ یورپی قزاقوں اور درندوں سے ساحلی علاقوں کے قبضے چھڑانے کے لیے 1525ء میں ایک بحری بیڑہ عدن کا محاصرہ چھڑانے کے لیے روانہ کیا۔ اسی طرح بحرِ ہند کے ساحلوں پر بھی پُرتگیزیوں کے ساتھ کئی معرکے پیش آئے۔ بعض معرکوں میں پرتگیزیوں کے ہاتھوں شکست بھی ہوئی۔ لیکن وہ شکستہ ہمت نہیں ہوئے اور برابر ان کی سرکوبی کے لیے مختلف محاذوں پر برسرِ پیکار رہے''۔

آج کا ظالم سامراج بھی تجارتی بحری راستوں کی بندش کا سبب بنا ہوا ہے جس سے پوری دنیا متاثر ہو رہی ہے۔ تاہم آفرین ہے ان پر جو اس ظالم کا مقابلہ کر رہے ہیں اور اس کے ناپاک عزائم کے آگے سدِ سکندری بن کر کھڑے ہیں۔

سلطان سلیمان کا آخری وقت: ہنگری، آسٹریا اور بعض دیگر یورپین ممالک نے جب معاہدوں کی پاسداری نہ کی تو سلطان نے ان کے خلاف اقدام کرنے کے لیے خود میدان میں آنے کا فیصلہ کیا۔ 76 سال کی عمر میں ضعف اور علالت کی وجہ سے گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتے تھے تو پالکی پر سوار ہو کر 1566ء کو فوج کے ساتھ قسطنطنیہ سے ہنگری کی طرف روانہ ہوئے۔ 5 اگست سے لے کر آٹھ اگست تک تمام قلعے فتح کر لیے۔ 5 اگست کی رات کو سلطان سلیمان کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ لیکن سپہ سالار نے سلطان کی موت کی خبر بالکل خفیہ رکھی اور سلطان کے نام سے تمام احکام جاری کرتا رہا۔ البتہ اس نے سلطان کے بیٹے شہزادہ سلیم کے پاس پوشیدہ طور پر اس حادثے کی اطلاع بھیج دی۔ (بقیہ: صفحہ 12 پر)

www.rahimia.org

(بقیہ: اقبال کے نام لیواؤں نے اقبال سے کیا سیکھا؟)

اقبال کی سیاسی فکر کا ایک نہایت اہم مگر نسبتاً کم زیرِ بحث پہلو معاشی انصاف کا سوال ہے۔ 28 مئی 1937ء کو بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کے نام اپنے خط میں انھوں نے مسلم لیگ کے طبقاتی کردار پر بنیادی سوال اٹھایا۔ انھوں نے توجہ دلائی کہ مسلم لیگ کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ بالادست مسلمان طبقات کی نمائندگی کرے گی یا عام مسلمان عوام کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرے گی۔ اس خط میں اقبال نے غربت اور روٹی کے مسئلے کو سیاسی جدوجہد کے مستقبل سے مربوط کیا۔ ان کے نزدیک محض سیاسی نمائندگی کا حصول کافی نہیں تھا؛ عام انسان کی معاشی زندگی میں حقیقی تبدیلی بھی ضروری تھی۔ یہ اقبال کی فکر کا وہ پہلو ہے جسے قومی تقریبات میں زیادہ نمایاں نہیں کیا جاتا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جاگیردارانہ اثر ورسوخ اور سرمایہ دارانہ مفادات کی موجودگی نے اقبال کے اس معاشی سوال کو ریاستی ترجیحات کا مستقل اور فیصلہ کن معیار بننے سے بڑی حد تک روکے رکھا، اور سیاست اکثر اقتدار کی تقسیم تک محدود ہوتی چلی گئی۔ اگر سیاسی آزادی کے باوجود عام انسان کے لیے معاشی تحفظ، تعلیم، علاج اور باوقار زندگی کے مواقع محدود رہیں تو اس آزادی کی اجتماعی معنویت پر سوال اٹھنا فطری ہے۔ یہاں اقبال کی فکر اور بعد کی قومی سیاست کے درمیان تضاد پوری شدت سے سامنے آتا ہے۔ اقبال نے جس عوامی معاشی مسئلے کو سیاسی جدوجہد کا مرکز بنانے کی ضرورت محسوس کی تھی، بعد کی سیاست میں وہ مسئلہ اکثر اقتدار کے حصول، اشرافیہ کے مفادات اور ریاستی طاقت کی تقسیم کے مباحث کے نیچے دب گیا۔ ہم نے اقبال کو شاعرِ مشرق اور مفکرِ پاکستان کے تمغے تو دے دیے، مگر ان کے معاشی سوالات کو ریاستی ترجیحات کا مستقل اور فیصلہ کن معیار نہ بنا سکے۔

اقبال 'دین' کو محض رسوم وعبادات کا مجموعہ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی فکر میں مذہب 'انسانی شخصیت کی تعمیر، اخلاقی قوت کی نشوونما اور اجتماعی زندگی کی تشکیل کا ایک فعال اصول تھا، لیکن برعظیم کی سیاسی تاریخ میں مذہبی شناخت کو جس انداز میں سیاسی طاقت کے حصول اور اجتماعی تقسیم کے لیے استعمال کیا گیا، اس نے دین کے اَخلاقی اور تہذیبی مقاصد کے بارے میں کئی سنگین سوالات پیدا کیے۔ مذہبی شناخت کی بنیاد پر سیاسی اجتماعیت قائم کرنے اور اس اجتماعیت کے اندر تمام شہریوں کے لیے مساوی حقوق، مذہبی آزادی اور مشترکہ قومی مفادات کا عادلانہ نظام تشکیل دینے کے درمیان ایک بنیادی فرق موجود ہے۔ اس فرق کو نظرانداز کرنے کے نتائج برصغیر کی تاریخ میں بار بار سامنے آئے ہیں۔ اقبال کی فکر کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے یہ سوال بھی اٹھانا چاہیے کہ ان کے تصورِ ملت میں مذہبی اجتماعیت اور جدید ریاست کی مساوی شہریت کے درمیان تعلق کو کس حد تک واضح کیا گیا تھا، اور بعد کی سیاسی تحریکوں نے اس مسئلے کو کس حد تک حل کیا؟ یہ سوال اقبال کی عظمت کو کم نہیں کرتا؛ بلکہ ان کی فکر کو ایک زندہ علمی روایت کے طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

گزشتہ ایک صدی میں اقبال کے ساتھ ہونے والا سب سے بڑا فکری حادثہ یہ ہے کہ انھیں ایک ایسی قومی یادگار میں تبدیل کر دیا گیا جہاں اظہارِ عظمت کے طور پر گلدستے سجائے جاتے ہیں اور گارڈ آف آنر پیش کیا جاتا ہے، مگر جس کے افکار پر سنجیدگی سے عمل کرنا مشکل ہے۔ اقبال کی فکر کو سمجھنے کے بجائے ہم نے ان کے اشعار کو اپنے پہلے سے قائم سیاسی اور مذہبی مؤقف کی تائید کے لیے استعمال کیا۔ خودی کو انفرادی کامیابی کا نعرہ، ملت کو سیاسی شناخت کا استعارہ، اجتہاد کو علمی تقریروں کا موضوع اور انقلاب کو جذباتی شاعری کا عنوان بنا دیا گیا۔ اس سے اقبال کی فکر کی وہ تنقیدی قوت کمزور ہوئی جو معاشرے کے مروجہ تصورات، اداروں اور طاقت کے ڈھانچوں پر سوال اٹھاتی تھی۔

اقبال کا اصل پیغام 'انسان کو سوچنے، سوال اٹھانے، اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے اور تاریخی عمل میں فعال کردار ادا کرنے کی دعوت دیتا ہے، لیکن ہم نے ان کے نام پر عقیدت کا ایسا ماحول پیدا کیا جس میں ان کی فکر کے بنیادی سوالات پر اختلاف اور تحقیق کو مطلوبہ اہمیت نہیں مل سکی۔ کسی مفکر کو غیر معمولی احترام دینا اور اس کی فکر کو علمی احتساب سے بالاتر قرار دینا دو مختلف باتیں ہیں۔ پہلی بات تہذیبی شعور کی علامت ہو سکتی ہے، جب کہ دوسری فکری جمود کا سبب بنتی ہے۔

برصغیر کی گزشتہ ایک صدی کی تاریخ کا بنیادی سبق یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کی تبدیلی بذاتِ خود معاشرتی انقلاب نہیں ہوتی۔ نوآبادیاتی اقتدار کے خاتمے کے بعد بھی معاشی ناہمواری، طبقاتی بالادستی، علمی پس ماندگی، فرقہ وارانہ کشمکش اور طاقت کے غیر منصفانہ استعمال جیسے مسائل مختلف صورتوں میں برقرار رہ سکتے ہیں۔

اس تاریخی تجربے کی روشنی میں اقبال کی فکر کا جائزہ دو سطحوں پر ضروری ہے:

1۔ اول یہ کہ اقبال کے فلسفیانہ، مذہبی اور سیاسی تصورات کی داخلی قوت اور حدود کا جائزہ لیا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ انھوں نے اپنے عہد کے بنیادی تضادات کو کس حد تک سمجھا اور ان کے حل کے لیے کس قدر رہنمائی پیش کی؟

2۔ دوم یہ کہ ان کے بعد آنے والی سیاسی، مذہبی اور تعلیمی قیادتوں نے ان تصورات کی کیا تعبیر کی، انھیں کن مقاصد کے لیے استعمال کیا اور ان کے اجتماعی نتائج کیا برآمد ہوئے؟ ان دونوں سوالات کو خلط ملط کرنا تاریخی تحقیق کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

اقبال کی فکر میں بیداری، تخلیقی عمل، اجتماعی خودمختاری اور انسانی عظمت کے طاقت ور عناصر موجود ہیں۔ تاہم ان کے سیاسی تصورات کی بعض تعبیرات، معاشی نظام کی غیر مکمل ادارہ جاتی توضیح اور مذہبی اجتماعیت و جدید ریاست کے تعلق جیسے معاملات مزید تنقیدی تحقیق کے متقاضی ہیں۔ اسی طرح بعد کی قومی ناکامیوں کو مکمل طور پر اقبال کے کھاتے میں ڈال دینا بھی درست نہیں۔ تاریخی نتائج بے شمار سیاسی، معاشی، سماجی اور عالمی عوامل سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار ہے کہ اقبال کی فکر کو قومی زندگی میں جس انداز سے استعمال کیا گیا، اس نے ان کے بنیادی سوالات کو حل کرنے کے بجائے کئی مواقع پر انھیں رسمی عقیدت کے پردے میں چھپا دیا۔

www.rahimia.org

Monthly RAHIMIA Lahore CPL No. 59

نومبر کا مہینہ ہمیں ایک مرتبہ پھر اقبال کے افکار کی طرف متوجہ کرتا ہے، لیکن اس موقع پر محض رسمی تقریبات، روایتی خطابات اور جذباتی شاعری سے آگے بڑھنا ضروری ہے۔ ہمیں پوچھنا چاہیے کہ اقبال کے تصورِ خودی نے ہمارے معاشرے میں کتنے آزاد اور خوددار انسان پیدا کیے؟ ان کے تصورِ اجتہاد نے ہماری علمی زندگی میں کتنی تخلیقی قوت پیدا کی؟ ان کی معاشی فکر نے عوام کی زندگی میں کتنی بہتری پیدا کی؟ ان کے تصورِ ملت نے اجتماعی عدل، سیاسی مساوات اور قومی وحدت کی کتنی مضبوط بنیادیں فراہم کیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا اقبال کے عقیدت مندوں نے اقبال کو سمجھنے کی بھی کوئی کوشش کی، یا ان کی شخصیت کو اپنی فکری کمزوریوں اور قومی ناکامیوں کی پردہ پوشی کے لیے ہی استعمال کیا؟ اقبال کی کاوشوں کا حقیقی اعتراف ان کے افکار کو مقدس نعروں میں تبدیل کرنا نہیں، بلکہ انھیں تاریخ، عقل، تجربے اور اجتماعی زندگی کے عملی نتائج کی کسوٹی پر پرکھنا ہے۔ ایک صدی کے تاریخی تجربات کے بعد ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ کسی قوم کی فکری ترقی اس کے مفکرین کی تعداد، ان کے مجسموں، یادگاروں یا ان کے نام سے منسوب اداروں اور شاہراہوں سے نہیں ناپی جاسکتی۔ اس کا اصل معیار یہ ہے کہ وہ قوم اپنے مفکرین کے اٹھائے ہوئے سوالات کا جواب اپنے علمی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی نظام میں کس حد تک فراہم کرتی ہے۔

اقبال نے اپنے عہد کے انسان کو محکومی، جمود اور بے عملی سے نکلنے کی دعوت دی تھی۔ اب اس دعوت کا تاریخی محاسبہ خود ہماری ذمہ داری ہے۔ اقبال کا اصل المیہ یہ نہیں کہ ان کے خواب مکمل طور پر شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے؛ اصل المیہ یہ ہے کہ ہم نے ان خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے کے بجائے خواب دیکھنے والے کی عظمت کو ہی اپنی کامیابی سمجھ لیا۔

اگر 9/نومبر کو محض یومِ اقبال کے بجائے قومی خود احتسابی کا دن بنانا ہے تو ہمیں یہ تلخ حقیقت قبول کرنا ہوگی کہ اقبال کو عقیدت کی نہیں، فکری دیانت کی ضرورت ہے؛ انھیں رسمی خراجِ تحسین کی نہیں، سنجیدہ علمی تحقیق کی ضرورت ہے؛ اور ان کے افکار کو جذباتی نعروں کی نہیں، اجتماعی زندگی میں قابلِ پیمائش عملی نتائج کی ضرورت ہے۔ تعلیمی اداروں، دانشوروں اور میڈیا کو اقبال کی فکر پر تنقیدی تحقیق کی روایت قائم کرنی چاہیے، تاکہ ان کے سوالات ہمارے معاشرتی نظام کا زندہ حصہ بن سکیں۔ آج بنیادی سوال یہ نہیں کہ اقبال نے ہمیں کیا دیا؛ اصل سوال یہ ہے کہ محبانِ اقبال نے ان سے کیا سیکھا، ان کی فکر کو کیا رخ دیا اور گزشتہ ایک صدی میں اپنے اجتماعی عمل سے اس کا کیا جواب دیا؟ (مدیر)

(بقیہ: سلطان سلیمان اعظم کی قانون اصلاحات اور دفاعی اقدامات)

ترک فوج نے۔ جو ڈیڑھ لاکھ پر مشتمل تھی۔ تمام علاقے اور قلعے فتح کر لیے تو واپسی پر سلطان کی لاش پر مصالحہ لگا کر اسے خراب ہونے سے محفوظ کر لیا گیا۔ لشکر کو یہ بتایا کہ سلطان بیماری کی وجہ سے پالکی سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اس تدبیر سے اس نے سات ہفتے تک سلطان کی وفات کو پوشیدہ رکھا۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ قسطنطنیہ میں شہزادہ سلیم تخت پر بیٹھ چکا ہے تو 24/اکتوبر 1566ء کو فوج کو جمع کر کے سلطان کی وفات کا اعلان کیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

دینی مسائل

اس صفحے پر قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں!

از حضرت مفتی عبدالقدیر شعبۂ دارالافتا ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

سوال حالتِ احرام میں سر والی چھتری سے سایہ کرنا کیسا ہے؟ کیا اس چھتری کا استعمال سر کو ڈھانپنے کے حکم میں نہیں ہوگا؟

جواب دھوپ اور گرمی سے بچنے کے لیے ہاتھ والی چھتری کے ذریعے سر پر سایہ کرنا سر کو ڈھانپنے کے حکم میں داخل نہیں۔ کیوں کہ یہ سر پر سایہ کرنا ہے نہ کہ سر کو ڈھانپنا۔ اس لیے حالتِ احرام میں اس کا استعمال جائز ہے۔ حدیثِ مبارکہ کی روشنی میں سر پر سایہ کرنا جائز ہے۔ چناں چہ صحیح مسلم کی حدیث ملاحظہ ہو: حضرت یحییٰ بن حصینؒ نے اپنی دادی حضرت ام حسینؓ سے روایت کی، (یحییٰ بن حصین نے) کہا: میں نے ان سے سنا، کہہ رہی تھیں: حجۃ الوداع کے موقع پر میں نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں حج کیا، میں نے آپؐ کو اس وقت جب آپؐ نے جمرہ عقبہ کو کنکریاں ماریں اور واپس پلٹے۔ آپ ﷺ اپنی سواری پر تھے۔ حضرت بلال اور حضرت اُسامہ آپؐ کے ساتھ تھے، ان میں سے ایک آگے سے (مہار پکڑ کر) آپ ﷺ کی سواری کو ہانک رہے تھے اور دوسرے دھوپ سے (بچاؤ کے لیے) اپنا کپڑا رسول اللہ ﷺ کے سر مبارک پر تانے ہوئے تھا۔

"رحیمیہ مطبوعات لاہور" کی جانب سے

دو اہم علمی کتب کے تیسرے ایڈیشنز کی اشاعت

علمی و تحقیقی اور فکری حلقوں میں نمایاں مقام رکھنے والے ادارے "رحیمیہ مطبوعات لاہور" کی طرف سے تاریخی و معاشی موضوعات پر مشتمل دو مایہ ناز کتابوں کے نئے (تیسرے)، نظرِ ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشنز زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ گئے ہیں۔ ان ایڈیشنز کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ قارئین کی سہولت کے لیے آیاتِ قرآنیہ، احادیثِ نبویہؐ، اصطلاحات، شخصیات، مقامات اور مصادر و مراجع کی مفصل فہارس تیار کر کے ان کتب کے آخر میں شامل کر دی گئی ہیں، جس سے ان کی علمی افادیت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ دو کتب درجِ ذیل ہیں:

1۔ برِصغیر میں تجدید دین کی تاریخ (اُردو ترجمہ: "التمهيد لتعريف أئمة التجديد"): تصنیف: امامِ انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔ مترجم: حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری۔ کل صفحات: 792۔

2۔ مقالاتِ معیشت: قرآن و سنت کی تعلیمات اور ولی اللّٰہی تشریحات کی روشنی میں مطالعۂ معاشیات۔ از حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری۔ اس ایڈیشن میں ایک نئے مقالے کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ کل صفحات: 544۔

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے رابطہ کیجیے: راؤ عتیق الرحمٰن خاں 0332-7203090

مدیر اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع و ناشر نے اے۔ جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہ نامہ "رحیمیہ" رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ لاہور سے جاری کیا۔